اردلی کی صورت دیکھتے ہی حقہ چھوڑا۔ چپکے سے کپڑے پہنے۔ بچوں کو دلاسا دیا اور حکم حاکم مرگ مفاجات سمجھ کر رواں دواں بنگلہ پر جا پہنچے۔ صاحب کے سامنے جاتے ہی ڈپٹی صاحب کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ اشاروں پر دوڑنے لگے۔ مسٹر کلارک نے سورداس کے زمین والے مقدمہ کی مسل منگوائی۔ اسے نہایت غور سے پڑھوا کر سنا۔ پھر ڈپٹی صاحب سے راجہ مہیندر کمار کے نام ایک پروانہ لکھایا جس کا مطلب یہ تھا۔ ''پانڈے پور میں سگریٹ کے کارخانہ کے لیے جو زمین لی گئی ہے وہ قانونی دفعہ کے منشاء کے خلاف ہے اس لیے میں اپنے حکم کو منسوخ کرتا ہوں۔ مجھے اس معاملہ میں دھوکا دیا گیا ہے اور ایک شخص کے ذاتی نفع کے لیے قانون کا ناجائز استعمال کیا گیا۔''

ڈپٹی صاحب نے دبی زبان سے اعتراض کیا۔ ''حضور۔ اب آپ کو اس حکم کے منسوخ کر دینے کا اختیار نہیں کیونکہ سرکار نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔''

مسٹر کلارک نے یہ سخت لہجہ میں کہا۔ ''ہمیں سرکار ہیں۔ ہم نے وہ قانون بنایا ہے۔ ہم کو سب اختیار ہے۔ آپ ابھی راجہ صاحب کو پروانہ لکھ دیں۔ کل لوکل گورنمنٹ کو اس کی نقل بھیج دیجیے گا۔ ضلع کے مالک ہم ہیں۔ صوبہ کی سرکار نہیں۔ یہاں بلوہ ہو جائے گا تو ہم کو اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ صوبہ کی سرکار یہاں دوڑی نہ آئے گی۔''

عمال تھرا اٹھے۔ ڈپٹی صاحب کو دل میں کوسنے لگے۔ یہ کیوں خواہ مخواہ دخل دیتے ہیں۔ انگریز ہیں کہیں غصہ میں آ کر مار بیٹھے تو اس کا کیا ٹھکانا۔ ضلع کا بادشاہ ہے۔ جو چاہے کرے۔ ہم سے کیا واسطہ۔

ڈپٹی صاحب کا سینہ بھی دہل گیا۔ پھر زبان نہ کھلی۔ پروانہ تیار ہو گیا۔ صاحب نے اس پر دستخط کیے۔ اسی وقت ایک اردلی پروانہ لے کر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ ڈپٹی یہاں سے اٹھے تو مسٹر جان سیوک کو اس حکم سے مطلع کر دیا۔

جان سیوک کھانا کھا رہے تھے۔ یہ خبر سنی تو بھوک غائب ہوگئی۔ بولے۔ ''یہ مسٹر کلارک کو کیا سوجھی؟'' مسز سیوک نے صوفیہ کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو نے انکار تو نہیں کر دیا؟ ضرور کچھ گول مال کیا ہے۔''

صوفیہ نے سر جھکا کر کہا۔ ''بس آپ کا غصہ مجھی پر رہتا ہے۔ جو کچھ کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں۔''

ایشور سیوک: خداوند یسوع! مجھ گناہ گار کو اپنے دامن میں چھپا! میں آخر تک منع کرتا رہا کہ بڈھے کی زمین نہ لو مگر کون سنتا ہے۔ دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ تو سٹھیا گیا ہے مگر میں نے دنیا دیکھی ہے۔ راجہ ڈر کر کلارک کے پاس گیا ہوگا۔

پربھو سیوک: میرا بھی یہی خیال ہے۔ راجہ صاحب نے خود مسٹر کلارک سے کہا ہو گا۔ آج کل ان کا شہر میں نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اندھے نے سارے شہر میں ہل چل مچا دی ہے۔

جان سیوک: میں سوچ رہا تھا کہ کل حفظ امن کے لیے پولیس کا دستہ مانگوں گا۔ ادھر یہ گل کھلا۔ کچھ عقل کام نہ کرتی کہ کیا بات ہوگئی۔

پربھو سیوک: میں تو سمجھتا ہوں ہمارے لیے اس زمین کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔ آج سورداس نہ پہنچ جاتا تو گودام کی خیریت نہ تھی۔ ہزاروں روپے کا سامان خراب ہو جاتا۔ یہ فساد رفع ہونے والا نہیں ہے۔

جان سیوک نے ان کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بہت اچھی بات ہے۔ ہم سب مل کر اس اندھے کے پاس چلیں اور اس کے قدموں پر سر جھکائیں۔ آج اس کے خوف سے زمین چھوڑ دوں۔ کل چمڑے کی آڑھت چھوڑ دوں اور اس کے بعد منہ چھپا کر یہاں سے کہیں چلا جاؤں۔ کیوں۔ یہی صلاح ہے نا؟ پھر امن ہی امن ہے۔ نہ کسی سے لڑائی نہ جھگڑا۔ یہ صلاح تمہیں مبارک ہو۔ دنیا امن کی جگہ نہیں بلکہ کارزار کی جگہ ہے۔ یہاں دلیروں اور بہادروں کی فتح ہوتی ہے۔ کمزور اور بزدل

مارے جاتے ہیں۔ مسٹر کلارک اور راجہ مہیندر کمار کی ہستی ہی کیا ہے۔ ساری دنیا بھی اب اس زمین کو میرے ہاتھوں سے نہیں چھین سکتی۔ میں سارے شہر میں ہل چل مچا دوں گا اور ہندوستان بھر کو ہلا ڈالوں گا۔ حکام کی خود مختارانہ روش کی یہ مثال ملک کے سبھی اخباروں میں شائع ہوگی۔ کونسلوں اور مجلسوں میں ایک نہیں ہزار ہزار آوازوں کے ذریعہ مشتہر کی جائے گی اور اس کی گونج انگریزی پارلیمنٹ تک پہنچے گی۔ یہ قومی حرفت اور تجارت کا سوال ہے۔ اس معاملہ میں کل ہندوستان کے کارخانہ دار کیا ہندوستانی اور کیا انگریز میرے معاون و مددگار ہوں گے اور سرکار ایسی نافہم نہیں ہے کہ وہ کارخانہ داروں کی مشترکہ آواز پر کان بند کر لے۔ یہ سرمایہ کی حکومت کا دور ہے۔ یورپ میں بڑی بڑی سلطنتیں سرمایہ داروں کے اشاروں پر بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ کسی گورنمنٹ کی مجال نہیں کہ ان کی مرضی کے خلاف عمل کرے۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں وہ ملایم چارہ نہیں ہوں جسے کلارک اور مہیندر چر جائیں گے۔''

پربھو سیوک تو ایسے سٹ پٹائے کہ پھر زبان نہ کھلی۔ چپکے سے اٹھ کر چلے گئے۔ صوفیہ بھی ایک لمحہ کے لیے سناٹے میں آ گئی۔ پھر سوچنے لگی اگر پاپا نے اس معاملہ میں کچھ تحریک کی بھی تو اس کا نتیجہ کہیں برسوں میں ظاہر ہوگا اور یہی کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ابھی سے اس کی کیوں فکر کروں۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر فاتحانہ غرور کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس وقت وہ اندو کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ دیکھنے کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر سکتی تھی۔ ''کاش میں وہاں موجود ہوتی دیکھتی کہ اندو کے چہرے پر کیسی جھینپ ہے۔ خواہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلق ہو جاتا مگر اتنا ضرور کہتی کہ دیکھا اپنے راجہ صاحب کا اقتدار و اختیار۔ بس اس پر اتنا اتراتی تھیں؟ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ کلارک اتنی عجلت کریں گے۔''

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرہ میں چلی گئی اور رانی اندو کی خفت کا خیال کر کے بے حد لطف اٹھانے لگی۔ راجہ صاحب بدحواس، چہرے کا رنگ اڑا ہوا، آ کر اندو

کے پاس بیٹھ جائیں گے۔ اندو دیوی لفافہ دیکھیں گی۔ آنکھوں پر اعتبار نہ ہوگا۔ پھر روشنی تیز کر کے دیکھیں گی۔ تب راجہ کے آنسو پونچھیں گی۔ ''آپ ناحق اس قدر غمگین ہوتے ہیں۔ آپ اپنی طرف سے شہر میں منادی کرا دیجیے کہ ہم نے سورداس کی زمین سرکار سے لڑ کر واپس دلا دی۔ سارے شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم مچ جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے آپ نے رائے عامہ کی قدر کی ہے۔ خوشامدی ٹٹو کہیں کا! چال سے ولیم کو الو بنانا چاہتا تھا۔ ایسی منہ کی کھائی ہے کہ یاد ہی کرے گا۔ خیر آج نہ سہی کل، پرسوں، ترسوں کبھی تو اندو سے ملاقات ہوگی ہی۔ کہاں تک منہ چھپائیں گی؟''

یہ سوچتے سوچتے صوفیہ میز پر بیٹھ گئی اور اس واقعہ پر ایک ہنسی کا ڈراما لکھنے لگی۔ سمندفکر کے لیے حسد تازیانہ کا کام دیتا ہے۔ صوفیہ نے آج تک کبھی ایسا ڈرامانہ لکھا تھا مگر اس وقت حسد کے اثر سے اس نے ایک گھنٹہ کے اندر چار منظروں کا ایک مضحکہ انگیز ڈراما لکھ دیا۔ ایسی ایسی چوٹ کرنے والی اور دل میں چٹکیاں لینے والی پھبتیاں قلم سے نکلیں کہ اسے اپنے ذہن کی رسائی پر خود ہی متحیر ہونا پڑا۔ اسے ایک بار یہ خیال آیا کہ میں کیا حماقت کر رہی ہوں۔ فتح پا کر ہارے ہوئے دشمن کا منہ چڑانا پرلے سرے کا کمینہ پن ہے، لیکن حسد نے اس کو مطمئن کر دینے کے لیے دلیل ڈھونڈ نکالی۔ ایسے فریبی، دغاباز، عزت کے بھوکے رعایا کے دوست بن کر اس کے حلق پر چھری پھیرنے والے خوشامدی رئیسوں کی یہی سزا ہے۔ یہی ان کا واحد مصلح ہے۔ عوام الناس کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف ہی انہیں راہ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔ رسوائی کا خوف نہ ہو تو وہ شیر ہو جائیں۔ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھیں۔

پربھو سیوک میٹھی نیند سو رہے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ یکایک صوفیہ نے آ کر جگایا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے اور یہ سمجھ کر کہ شاید اس کے کمرہ میں چور گھس آئے

ہیں، دروازہ کی طرف دوڑے۔ گودام کا واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ صوفیہ نے ہنستے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''کہاں بھاگے جاتے ہو؟''

پربھوسیوک: کیا چور ہیں؟ لالٹین جلالوں۔

صوفیہ: چور نہیں ہیں۔ ذرا میرے کمرہ میں چلو۔ تمہیں ایک چیز سناؤں۔ ابھی لکھی ہے؟

پربھوسیوک: واہ اتنی سی بات کے لیے نیند خراب کر دی۔ کیا پھر سویرا نہ ہوتا۔ کیا لکھا ہے؟

صوفیہ: ایک مضحکہ خیز ڈراما ہے۔

پربھوسیوک: مضحکہ خیز ڈراما؟ تم نے ایسا ڈراما لکھنے کی کب سے مشق کی؟

صوفیہ: آج ہی بہت ضبط کیا کہ صبح سناؤں گی پر نہ رہا گیا۔

پربھوسیوک صوفیہ کے کمرہ میں گئے اور ایک ہی لمحہ میں دونوں نے قہقہے لگانے شروع کیے۔ لکھتے وقت صوفیہ کو جن فقرات پر ذرا بھی ہنسی نہ آئی تھی، انہی کو پڑھتے وقت اس کی ہنسی روکے نہ رکتی تھی۔ جب کوئی ہنسانے والی بات آ جاتی تو صوفی پہلے ہی ہنس پڑتی۔ پربھوسیوک منہ کھولے ہوئے اس کی طرف تاکتا۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی مگر اس کی ہنسی پر وہ بھی ہنستا اور جونہی بات سمجھ میں آ جاتی تو یہی ہنسی قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتی۔ دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ یہاں تک کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔ ڈراما کے ختم ہوتے ہوتے قہقہہ کی جگہ کھانسی نے لے لی۔ خیریت تھی کہ دروازے دونوں طرف سے بند تھے ورنہ رات کے سناٹے میں سارا بنگلہ ہل جاتا۔

پربھوسیوک: نام بھی خوب رکھا۔ راجہ مچھیند رسنگھ۔ مہیند راور مچھیند ر کی تک ملتی ہے۔ پلپلی صاحب کے ہنٹر کھا کر مچھیند رسنگھ کا جھک جھک کر سلام کرنا خوب رہا۔ کہیں راجہ صاحب زہر نہ کھا لیں۔

صوفیہ: ایسا حیادار نہیں ہے۔

پربھوسیوک: تم ہنسی کے ناٹک لکھنے میں مشاق ہو۔

ذرا دیر بعد دونوں اپنے اپنے کمرہ میں سوئے۔ صوفیہ علی الصباح اٹھی اور مسٹر کلارک کا انتظار کرنے لگی اسے یقین تھا کہ وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان کو ساری باتیں بالتفصیل معلوم ہوں گی۔ ابھی محض افواہ سنی ہے۔ ممکن ہے راجہ صاحب گھبرائے ہوئے ان کے پاس اپنا دکھڑا رونے کے لیے گئے ہوں، لیکن آٹھ بج گئے اور کلارک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ بھی تڑکے ہی آنے کو تیار تھے، پر آتے ہوئے شرماتے تھے کہ کہیں صوفیہ یہ نہ سمجھے کہ مجھ پر احسان جتانے آئے ہیں۔ اس سے زیادہ اس بات کا خوف تھا کہ وہاں لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ یا تو مجھے دیکھ کر لوگ دل ہی دل میں جلیں گے یا کھلے الفاظ میں مجھے متہم کریں گے۔ سب سے زیادہ خوف ایشور سیوک کا تھا کہ کہیں کافر ملعون یا شقی نہ کہہ بیٹھیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ان کی باتوں کا جواب ہی کیا۔ انہیں وجوہات سے وہ آتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور دل میں دعا کر رہے تھے کہ صوفیہ ہی ادھر آ نکلے۔

نو بجے تک کلارک کا انتظار کرنے کے بعد صوفیہ بیتاب ہوگئی۔ ارادہ کیا کہ میں ہی چلوں۔ اسی وقت یکا یک مسٹر جان سیوک آ کر بیٹھ گئے اور صوفیہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ''صوفی! مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔''

صوفیہ: میں نے! میں نے کیا کیا؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

جان سیوک: میرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہی ترغیب سے مسٹر کلارک نے اپنا پہلا حکم منسوخ کر دیا ہے۔

صوفیہ: آپ کو وہم ہے۔

جان سیوک: میں نے بلا ثبوت کے آج تک کسی پر الزام نہیں لگایا۔ میں ابھی اندو

دیوی سے مل کر آ رہا ہوں۔ انہوں نے اس کا ثبوت دیا کہ یہ تمہاری ہی کرتوت ہے۔

صوفیہ: آپ کو یقین ہے کہ اندو نے مجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے؟

جان سیوک: اس کو غلط سمجھنے کے لیے میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

صوفیہ: اسے صحیح سمجھنے کے لیے اگر اندو کا کہنا کافی ہے تو اسے غلط سمجھنے کے لیے میرا کہنا کیوں کافی نہیں ہے؟

جان سیوک: سچ بات یقین کو پیدا کرتی ہے۔

صوفیہ: یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اپنی باتوں میں وہ نمک مرچ نہیں لگا سکتی، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اندو نے ہمارے اور ولیم کے درمیان میں مغائرت پیدا کرنے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔

جان سیوک نے شبہ میں پڑ کر کہا۔ ''صوفی! میری طرف دیکھ! کیا تو سچ کہہ رہی ہے؟''

صوفیہ نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے والد کی طرف بے خوف آنکھوں سے دیکھے، لیکن اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ باطنی احساس زبان کو بگاڑ سکتا ہے مگر اعضاء پر اس کا زور نہیں چلتا۔ زبان چاہے خاموش ہو جائے مگر آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ مسٹر جان سیوک نے اس کی پر ندامت آنکھیں دیکھیں اور کبیدہ خاطر ہو کر بولے۔ ''آخر تم نے کیا سمجھ کر یہ کانٹے بوئے؟''

صوفیہ: آپ میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہیں۔ آپ کو ولیم ہی سے یہ بات صاف کر لینی چاہیے۔ ہاں میں اتنا ضرور کہوں گی کہ تمام شہر میں بدنام ہونے کی بہ نسبت میں اس زمین کا آپ کے قبضہ سے نکل جانا کہیں بہتر خیال کرتی ہوں۔

جان سیوک: اچھا تو تم نے میری نیک نامی کے لیے یہ چال چلی ہے؟ میں تمہارا بہت ممنون ہوں، لیکن یہ خیال تمہیں بہت دیر بعد سوجھا۔ عیسائی قوم یہاں صرف

اپنے مذہب کے سبب اتنی بدنام ہے کہ اس سے زیادہ بدنام ہونا غیر ممکن ہے۔عوام کا بس چلے تو آج ہمارے سارے گرجے مٹی کے ڈھیر بن جائیں۔ انگریزوں سے لوگوں کو اتنی چڑ نہیں ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کا طرز معاشرت ان کے خیالات واطوار سب ان کی ذاتی چیزیں ہیں۔یعنی ان کے ملک وقوم کے ہیں،لیکن جب کوئی ہندوستانی خواہ وہ کسی مذہب کا ہو انگریزی وضع اختیار کرتا ہے تو لوگ اس کو بالکل گیا گزرا سمجھ لیتے ہیں۔وہ نیکی وبدی کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔اس سے کسی کو بھلے کاموں کی امید نہیں ہوتی اور نہ اس کے برے کاموں پر کسی کو تعجب ہوتا ہے۔ میں یہ کبھی نہ مانوں گا کہ تم نے میری آبرو قائم رکھنے کے لیے یہ کوشش کی ہے۔تمہارا مقصد صرف میرے تجارتی منصوبوں کو برباد کرنا ہے۔ مذہبی تحقیقات نے تمہاری عملی فراست کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔تمہیں اتنی سمجھ بھی نہیں ہے کہ نفس کشی اور فیض رسانی محض ایک معیار ہے۔شعراء کے لیے،معتقدین کے دل بہلاؤ کے لیے اور ناصحوں کی تصاویر کو مزین کرنے کے لیے۔مسیح،بدھ اور موسیٰ کے پیدا ہونے کا وقت اب نہیں رہا۔دولت یا ثروت مطعون ہونے پر بھی انسانی خواہشات کی معراج ہے اور رہے گی۔خدا کے لیے تم مجھ پر اپنے مذہبی اصولوں کو نہ آزماؤ۔ میں تم سے اخلاق اور مذہب کا سبق نہیں پڑھنا چاہتا۔تم سمجھتی ہو کہ خدا نے عدل و راستی ورحم کا تمہیں کو اجارہ دار بنا دیا ہے اور دنیا میں جتنے اہل دولت وثروت ہیں وہ سب کے سب بے انصاف،خودسر اور بے رحم ہیں لیکن مشیت ایزدی کی قائل ہو کر بھی تمہارا خیال ہے کہ دنیا میں نابرابری اور تفریق کا سبب صرف انسان کی خودغرضی ہے تو مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ تم نے مذہبی کتب کا مطالعہ آنکھیں بند کر کے کیا ہے، ان کا مطلب نہیں سمجھا۔تمہاری اس بدسلوکی سے مجھے جتنا رنج ہو رہا ہے،اسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور گو میں ولی یا درویش نہیں ہوں لیکن یاد رکھنا کہ کبھی نہ کبھی تم کو اپنے والد سے دشمنی کرنے کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔

''بد دعا غصہ کی انتہائی حد ہے۔ اس کا پھل تم ایشور سے پاؤ گے۔'' یہ جملہ تیغ و سنان سے بھی زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ کسی برے کام کی سزا دینے کے لیے دنیاوی طاقت کافی نہیں ہے۔ اس وقت ہم خدائی طاقت کو محرک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے کمتر کوئی سزا بھی ہمیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

مسٹر جان سیوک اس طرح کوس کر اٹھ گئے، لیکن صوفیہ کو اس سخت کلامی سے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ اس نے اس قرض کو بھی اندو کے کھاتہ میں درج کر دیا اور اس کے جذبہ انتقام نے زیادہ خوفناک صورت اختیار کر لی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اس پر مذاق ڈراما کو آج ہی شائع کروں گی۔ اگر ایڈیٹر نے نہ چھاپا تو میں خود ہی کتابی صورت میں چھپواؤں گی اور عوام میں مفت تقسیم کروں گی۔ ایسی کالک لگ جائے کہ پھر کسی کو منہ نہ دکھا سکے۔

ایشور سیوک نے جان سیوک کی ناملایم باتیں سنیں تو بہت ناراض ہوئے۔ مسز سیوک کو بھی یہ برتاؤ برا معلوم ہوا۔ ایشور سیوک نے کہا۔ ''نہ جانے تمہیں اپنے نفع نقصان کی تمیز کب ہوگی۔ بنی ہوئی بات کو نباہنا مشکل نہیں ہے، بگڑی ہوئی بات کو بنانا مشکل ہے۔ تمہیں اس موقع پر اس قدر صبر و سنجیدگی سے کام لینا تھا کہ جتنا نقصان ہو چکا ہے۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ گھر کا ایک گوشہ گر پڑے تو سارا گھر گرا دینا عقل مندی نہیں ہے۔ زمین گئی تو کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ اس پر پھر تمہارا قبضہ ہو، یہ نہیں کہ زمین کے ساتھ اپنی عزت و آبرو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو۔ جا کر راجہ صاحب کو مسٹر کلارک کے فیصلہ کی اپیل کرنے پر آمادہ کرو اور مسٹر کلارک سے اپنا میل جول بدستور قائم رکھو۔ یہ سمجھ لو کہ ان سے تمہیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ صوفیہ کو برہم کر کے تم مسٹر کلارک کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ حکام تک رسائی رہے گی تو ایسی کتنی ہی زمینیں ملیں گی۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا اور مشکل کو آسان کر۔''

مسز سیوک: میں تو اتنی منتوں سے اسے یہاں لائی اور تم سارے کیے دھرے پر

پانی پھیرے دیتے ہو۔

ایشو رسیوک: خداوند۔ مجھے آسمان کی بادشاہت دے۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ صوفی کے ایماء سے یہ بات ہوئی تو بھی ہمیں اس سے کوئی شکایت نہ ہونی چاہیے بلکہ میرے دل میں تو اس کی عزت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسے خدا نے سچی روشنی عطا کی ہے۔ اس میں ایمان اور اعتقاد کی برکت ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی تعریف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔ خداوند یسوع نے اپنے کو غریبوں اور بیکسوں پر نثار کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے ہم لوگوں میں اتنا اعتقاد نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خودغرضی پر نادم ہونا چاہیے۔ صوفیہ کے نیک ارادوں کی تحقیر کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔ گنہگار کسی فقیر کو دیکھ کر دل میں نادم ہوتا ہے۔ اس سے دشمنی نہیں کرتا۔

جان سیوک: یہ نہ اعتقاد ہے اور نہ ایمان بلکہ محض ضد اور نخوت ہے۔

ایشو رسیوک نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اپنی لکڑی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرہ میں آئے اور بولے۔ ''بیٹی! میرے آنے سے تمہارا کوئی ہرج تو نہیں ہوا؟''

صوفیہ: نہیں نہیں آیئے بیٹھیے۔

ایشو رسیوک: یسوع! اس گنہگار کو ایمان کی روشنی عطا کر! ابھی جان سیوک نے تمہیں بہت کچھ برا بھلا کہا ہے۔ انہیں معاف کرو۔ بیٹی دنیا میں خدا کی جگہ اپنا باپ ہی ہوتا ہے۔ اس کی باتوں کا برا نہ ماننا چاہیے۔ تمہارے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔ خدا کی برکت ہے۔ تمہارے والد کی ساری عمر خود پروری میں گزری ہے اور وہ ابھی تک اسی طرح گزر رہی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ اس کے دل کی تاریکی ایمان کی تجلی سے دور کرے۔ جن لوگوں نے ہمارے خداوند یسوع کو طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں ان کے لیے خداوند نے کہا تھا کہ اے خدا انہیں معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

صوفیہ: میں آپ سے سچ کہتی ہوں۔ مجھے پاپا کی باتوں کا ذرا بھی ملال نہیں ہے،

لیکن وہ مجھ پر غلط الزام لگاتے ہیں۔ اندو کی باتوں کے سامنے میری باتوں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

ایشور سیوک: بیٹی یہ ان کی غلطی ہے مگر تم اپنے دل سے انہیں معاف کر دو۔ دنیا داروں کو اس قدر مطعون کیا گیا۔ مگر انصاف کی نظر سے دیکھو تو وہ کتنے قابل رحم ہیں۔ آخر آدمی جو کچھ کرتا ہے، اپنے بال بچوں ہی کے لیے تو کرتا ہے۔ انہیں کے آرام و اطمینان کے لیے انہیں کو دنیا کی بدنظری سے بچانے کے لیے وہ تمام بدنامیوں اور رسوائیوں کو بخوشی برداشت کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے ضمیر اور ایمان کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں جب وہ دیکھتا ہے کہ میں جن لوگوں کے فائدے کے لیے اپنا خون اور پسینہ ایک کر رہا ہوں، وہی مجھ سے مخالفت کر رہے ہیں، تو فطرتاً جھنجھلا اٹھتا ہے۔ اس وقت اسے حق و ناحق کی تمیز نہیں رہتی۔ دیکھو کلارک سے بھول کر بھی ان باتوں کا ذکر نہ کرنا ورنہ خواہ مخواہ دلوں میں کدورت پیدا ہو جائے گی۔ بولو وعدہ کرتی ہو؟

ایشور سیوک جب اٹھ کر چلے گئے تو پربھو سیوک نے آ کر پوچھا۔ ''وہ ڈراما کہاں بھیجا؟''

صوفیہ: ابھی تو کہیں نہیں بھیجا۔ کیا بھیج ہی دوں؟

پربھو سیوک: ضرور ضرور مزہ آ جائے گا۔ تمام شہر میں دھوم مچ جائے گی۔

صوفیہ: ذرا دو ایک روز اور دیکھ لوں۔

پربھو سیوک: نیک کام کے کرنے میں تاخیر نہ ہونی چاہیے۔ آج ہی بھیجو۔ میں نے بھی آج اپنی نظم ختم کر دی۔ سناؤں؟

صوفیہ: ہاں ہاں پڑھو۔

پربھو سیوک نے اپنی نظم سنانی شروع کی۔ ساری نظم رحم اور عفو کی جذبات سے لبریز تھی۔ مضمون اس قدر پر درد تھا کہ صوفیہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

پربھوسیوک بھی رو رہے تھے۔عفو ومحبت کے جذبات ہرلفظ سے اسی طرح ٹپک رہے تھے جیسے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں۔نظم ختم ہوگئی تو صوفیہ نے کہا۔''مجھے کبھی خیال بھی نہ ہوسکتا تھا کہ اس رنگ میں ایسا کمال دکھا سکتے ہو۔جی چاہتا ہے تمہارا قلم چوم لوں۔اف کتنا روحانی عفو ہے۔برا نہ ماننا،تمہاری تصنیف تم سے بدرجہا بلندتر ہے۔ایسے پاکیزہ ملائم اور پرجوش الفاظ تمہارے قلم سے کس طرح نکل آتے ہیں؟''

پربھوسیوک: اسی طرح جیسے اتنے مضحکہ خیز اور نحوت شکن جذبات کا اظہار تمہارے قلم سے ہوا۔تمہاری تصنیف تم سے کہیں زیادہ پست ہے۔

صوفیہ: میں کیا اور میری تصنیف کیا۔تمہارا ایک ایک شعر اس قابل ہے کہ اس پر دل نثار ہو جائے۔بے شک عفو انسانی جذبات میں رفیع ترین جذبہ ہے۔رحم کا درجہ اتنا بلند نہیں۔رحم وہ دانہ ہے جو پولی کی زمین میں اگتا ہے۔اس کے خلاف عفو وہ دانہ ہے جو خارزاروں میں اگتا ہے۔رحم وہ چشمہ ہے جو ہموار زمین پر بہتا ہے۔اس کے برعکس عفو کا چشمہ سنگریزوں اور چٹانوں پر بہتا ہے۔رحم کا راستہ سیدھا اور آسان ہے اور عفو کا ٹیڑھا اور مشکل۔تمہارا ایک ایک لفظ دل پر نقش ہو جاتا ہے۔تعجب ہے کہ تم میں خود عفو کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔

پربھو: صوفی! جذبات کے مقابلہ میں افعال کی کچھ وقعت نہیں ہے۔شاعر کا عملی میدان محدود ہوتا ہے مگر جذباتی میدان وسیع اور لامحدود۔اس آدمی کو حقیر نہ سمجھو جو ترک اور استغناء کا راگ الاپتا ہے مگر خود کوڑیوں پر جان دیتا ہو!ممکن ہے کہ اس کے الفاظ کسی بڑے گنہگار کے دل کو متاثر کر دیں۔

صوفیہ: جس کے قول وفعل میں اتنا فرق ہو، اسے کسی اور ہی نام سے پکارنا چاہیے۔

پربھوسیوک: نہیں صوفی یہ بات نہیں ہے۔شاعر کے جذبات بتلاتے ہیں کہ اگر

اسے موقع ملتا تو وہ کیا کچھ ہوسکتا تھا۔ اگر وہ اپنے جذبات کی بلندی تک نہ پہنچ سکا تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ گردوپیش کے حالات اس کے موافق نہ تھے۔

کھانے کا وقت آ گیا۔ اس کے بعد صوفیہ نے ایشور سیوک کو بائبل سنانا شروع کیا۔ آج کی سی عجز و رضا جوئی اس نے کبھی نہ ظاہر کی تھی۔ ایشور سیوک کی مذہبی محویت نے ان کے ہوش و حواس کو مغلوب کر دیا تھا۔ خواب کی حالت میں ہو جانا ہی ان کی اندرونی بیداری تھی۔ کرسی پر لیٹے ہوئے وہ خراٹے لے لے کر خدائی کتاب کو سن رہے تھے، لیکن تعجب یہ تھا کہ پڑھنے والا انہیں سوتا ہوا سمجھ کر جوں ہی خاموش ہو جاتا تو وہ فوراً ہی بول اٹھتے۔ ''ہاں ہاں پڑھو۔ چپ کیوں ہو؟ میں سن تو رہا ہوں۔''

صوفیہ کو بائبل پڑھتے پڑھتے شام ہو گئی تو اس کا گلا چھوٹا۔ ایشور سیوک باغ میں ٹہلنے چلے گئے اور پربھو سیوک کو صوفی سے گپ شپ کرنے کا موقع ملا۔

صوفیہ: بڑے پاپا ایک بار پکڑ پاتے ہیں تو پھر گلا نہیں چھوڑتے۔

پربھو سیوک: مجھ سے کبھی بائبل پڑھنے کو نہیں کہتے۔ مجھ سے تو ایک لمحہ بھی وہاں نہ بیٹھا جائے۔ تم نہ جانے کیسے بیٹھی پڑھتی رہتی ہو؟

صوفیہ: کیا کروں ان پر رحم آتا ہے۔

پربھو سیوک: بنا ہوا ہے۔ مطلب کی بات پر کبھی نہیں چوکتا۔ یہ ساری عقیدت صرف دکھاوا ہے۔

صوفیہ: یہ تمہاری بے انصافی ہے۔ ان میں اور چاہے کوئی وصف نہ ہو، لیکن یسوع پر ان کا زبردست اعتقاد ہے چلو کہیں گھومنے چلتے ہو؟

پربھو سیوک: کہاں چلو گی؟ چلو یہیں حوض کے کنارے بیٹھ کر کچھ شعر و شاعری کی چرچا کریں۔ مجھے تو اس سے زیادہ لطف اور کسی بات میں نہیں آتا۔

صوفیہ: چلو پانڈے پور کی طرف چلیں۔ کہیں سورداس مل گیا تو اسے یہ خبر سنائیں گے۔

پربھوسیوک: پھولا نہ سمائے گا۔ اچھل پڑے گا۔

صوفیہ: ذرا شبہ پا جائے تو اس راجہ کو شہر سے بھگا کر ہی چھوڑے۔

دونوں نے سڑک پر جا کر ایک تانگہ کرایہ پر کیا اور پانڈے پور کی طرف روانہ ہوئے۔ آفتاب غروب ہو گیا تھا۔ کچہری کے عملے بغل میں بستہ دبائے مردہ دلی اور خودغرضی کا مجسمہ بنے ہوئے چلے آ رہتے تھے۔ بنگلوں میں ٹینس ہو رہا تھا۔ شہر کے شہدے دین و دنیا سے بےخبر تمبولیوں کی دکانوں پر جمع تھے۔ بنیوں کی دکانوں پر مزدوروں کی عورتیں کھانے کا سامان خرید رہی تھیں۔ تانگہ برنا ندی کے پل پر پہنچا کہ یکا یک آدمیوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ سورداس کھنجری بجا کر گا رہا تھا۔ صوفیہ نے تانگہ روک دیا اور تانگہ والے سے کہا۔ ''جا اس اندھے کو بلا لا۔''

ایک لمحہ میں سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ: مجھے پہچانتے ہو سورداس؟

سورداس: ہاں بھلا ہجور ہی کو نہ پہچانوں گا۔

صوفیہ: تم نے ہم لوگوں کو سارے شہر میں خوب بدنام کیا۔

سورداس: پھریادکرنے کے سوا میرے پاس اور کون بل تھا؟

صوفیہ: فریاد کا نتیجہ نکلا؟

سورداس: میری منشا پوری ہو گئی۔ حاکموں نے میری دھرتی مجھے دے دی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی کام تن من سے کیا جائے اور اس کا کوئی پھل نہ ہو۔ تپسیا سے تو بھگوان مل جاتے ہیں۔ بڑے صاحب کے اردلی نے کل رات ہی مجھے یہ حال کہہ سنایا۔ آج پانچ براہمنوں کو بھوجن کرایا ہے۔ کل گھر چلا جاؤں گا۔

پربھوسیوک: مس صاحبہ ہی نے بڑے صاحب سے کہہ سن کر تمہاری زمین دلوائی ہے۔ ان کے والد اور راجہ صاحب دونوں ہی ان سے ناراض ہو گئے ہیں۔ ان کی تمہارے اوپر بڑی مہربانی ہے۔

صوفیہ: پربھو! تم پیٹ کے بڑے ہلکے ہو۔ یہ کہنے سے کیا فائدہ کہ مس صاحب ہی نے زمین دلوائی ہے۔ یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہے۔

سورداس: صاحب یہ تو میں اسی دن جان گیا تھا جب مس صاحب سے پہلے پہل باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے چت میں دیا اور دھرم ہے۔ اس کا پھل بھگوان ان کو دیں گے۔

صوفیہ: سورداس یہ میری سفارش کا پھل نہیں۔ تمہاری تپسیا کا پھل ہے۔ راجہ صاحب کو تم نے خوب جھکایا اب تھوڑی سی کسر اور ہے ایسا بدنام کر دو کہ شہر میں منہ دکھانے لائق نہ رہیں۔ استعفے دے کر اپنے علاقہ کی راہ لیں۔

سورداس: نہیں مس صاحب یہ کھلاڑیوں کی نیت نہیں ہے۔ کھلاڑی جیت کر ہارنے والے کھلاڑی کی ہنسی نہیں اڑاتا۔ اس سے گلے ملتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ بھیا! اگر ہم نے کھیل میں تم سے کوئی انوچت (نا مناسب) بات کہی ہو یا کوئی ایسا برتاؤ کیا ہو تو ہمیں ماپھ (معاف) کرنا۔ اس طرح دونوں کھلاڑی ہنس کر الگ ہوتے ہیں۔ کھیل سماپت (ختم) ہوتے ہی دونوں متر (دوست) بن جاتے ہیں۔ اس میں کوئی کپٹ نہیں رہتا۔ میں آج راجہ صاحب کے پاس گیا تھا اور ان سے ہاتھ جوڑ آیا۔ انہوں نے مجھے بھوجن کرایا۔ جب چلنے لگا تو بولے میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہے کہ سنکا (اندیشہ) نہ کرنا۔

صوفیہ: ایسے صاف دل تو نہیں ہیں۔ موقع پا کر ضرور دغا کریں گے۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں۔

سورداس: نہیں مس صاحب ایسا مت کہیے۔ کسی پر سنکا کرنے سے اپنا چت (دل) ملین (مکدر) ہوتا ہے۔ وہ بدوان (عالم) ہیں۔ دھرماتما ہیں۔ کبھی دغا نہیں کر سکتے۔ اور جو کریں گے تو انہی کا دھرم جائے گا۔ میں پھر اسی طرح فریاد کرتا پھروں گا۔ جس بھگوان نے اب کی سنا ہے، وہی بھگوان پھر سنیں گے۔

پربھوسیوک: اور جوکوئی معاملہ کھڑا کر کے قید کرا دیا تو ؟

سورداس: (ہنس کر) اس کا پھل انہیں بھگوان سے ملے گا۔ میرا دھرم تو یہی ہے کہ جب کوئی میری چیز پر ہاتھ بڑھائے تو اس کا ہاتھ پکڑ لوں۔ وہ لڑے تو لڑوں اور اس چیز کے لیے جان تک دے دوں۔ چیز میرے ہاتھ آئے گی، اس سے مجھے مطلب نہیں۔ میرا کام تو لڑنا ہے اور وہ بھی دھرم کی لڑائی لڑنا۔ اگر راجہ صاحب دگا (دغا) بھی کریں گے تو میں ان سے دگا نہ کروں گا۔

صوفیہ: لیکن میں تو راجہ صاحب کو اتنے سستے نہ چھوڑوں گی۔

سورداس: مس صاحب۔ آپ ودوان ہو کر ایسی باتیں کرتی ہو۔ مجھے اچرج (تعجب) ہوتا ہے۔ آپ کے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ نہیں آپ ہنسی کر رہی ہیں۔ آپ سے کبھی ایسا کام نہیں ہوسکتا۔

اتنے میں کسی نے پکارا۔ ''سورداس چلو! برہمن آ گئے ہیں۔''

سورداس لاٹھی ٹیکتا ہوا گھاٹ کی طرف چلا۔ تانگہ بھی چلا۔ پربھوسیوک نے کہا۔ ''چلو گی مسٹر کلارک کی طرف؟''

صوفیہ: نہیں گھر چلو۔

راستہ میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ صوفیہ کسی خیال میں محو تھی۔ دونوں سگرا پہنچے تو چراغ جل چکے تھے۔ صوفیہ سیدھی اپنے کمرہ میں گئی۔ میز کی دراز کھولی، فارس (ظرافت آمیز ڈراما) کا مسودہ نکالا اور اسے پرزہ پرزہ کر کے زمین پر پھینک دیا۔

(21)

سورداس کی آہ وفریاد نے راجہ مہیندر کمار کی ناموری اور عزت کو خاک میں ملا دیا۔ وہ آسمان سے باتیں کرنے والا شہرت کا محل آن کی آن میں مسمار ہو گیا۔ اہل شہر ان کی خدمات کو بھول گئے۔ ان کی مساعی سے شہر کو کتنا نفع پہنچا تھا۔ اس کی یاد کسی کو نہ رہی۔ شہر کی نالیاں اور سڑکیں، باغیچے اور گلی کوچے ان کی مسلسل کوششوں کے

کتنے رہین منت تھے۔شہر کی صحت اور تعلیم کو انہوں نے کس گری ہوئی حالت سے اٹھا کر شاہراہ ترقی پر پہنچایا تھا۔اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیتا تھا۔دیکھتے دیکھتے ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔لوگ ان پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے۔اب وہ زمانہ نہیں رہا جب راجے رئیسوں کے نام عزت کے ساتھ لیے جاتے تھے۔عوام کو خود ہی ان سے عقیدت ہوتی تھی۔وہ دن رخصت ہو گئے۔ثروت پرستی زمانہ قدیم کی شاہ پرستی ہی کا ایک جزو تھی۔رعایا اپنے راجہ جاگیردار یہاں تک کہ اپنے زمیندار پر جان نثار کر دیتی تھی۔یہ ایک مسلمہ اصول سیاست تھا کہ رعایا بادشاہ کے آرام و آسائش کے لیے ہے۔دنیا میں یہی رواج تھا،لیکن آج بادشاہ اور رعایا میں وہ تعلق نہیں رہا۔آج ان میں خادم ومخدوم کا رشتہ ہے۔اب اگر کسی بادشاہ کی عزت ہے تو خدمتی اعتبار سے،ورنہ اس کی حالت دانتوں کے نیچے دبی ہوئی زبان کی سی ہے۔رعایا کو اس پر کبھی اعتماد نہیں ہوتا۔اب تو اسی بادشاہ کی عزت ہوتی ہے جس نے اپنا سب کچھ رعایا پر نثار کر دیا ہو۔جو فقر کی دولت سے مالا مال ہو۔جب تک کوئی خدمت کے راستہ پر چلنا نہیں سیکھتا عوام کے دلوں میں جگہ نہیں پاتا۔

راجہ صاحب کو اب معلوم ہوا کہ شہرت اس سفید کپڑے کی طرح ہے جس پر ایک دھبہ بھی نہیں چھپ سکتا۔جس طرف ان کی موٹر نکل جاتی،لوگ ان پر آوازے کستے۔یہاں تک کہ اکثر تالیاں بھی بجتیں۔بے چارے بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔شہرت حاصل کرنے چلے تھے۔عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور موقعوں پر اندو سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔اس سے دل کو ڈھارس ہوتی تھی،لیکن اب وہ دروازہ بھی بند تھا۔اندو سے ہمدردی کی کوئی امید نہ تھی۔

رات کے نو بجے تھے۔راجہ صاحب اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے اس طرح سوچ رہے تھے۔لوگ کتنے احسان فراموش ہوتے ہیں۔میں نے اپنی زندگی کے متواتر سات سال ان کی خدمت میں صرف کر دیئے۔اپنا کتنا وقت،کتنا تجربہ،کتنا

آرام ان کی نذر کیا۔ اس کا مجھے آج یہ صلہ مل رہا ہے کہ ایک اندھا بھکاری مجھے سارے شہر میں گالیاں دیتا پھرتا ہے اور کوئی اس کی زبان نہیں پکڑتا بلکہ لوگ اسے اور بھی اکساتے اور بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس قدر باقاعدگی سے اپنے علاقہ کا انتظام کرتا تو اب تک نکاسی میں لاکھوں روپوں کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔ ایک دن وہ تھا کہ جدھر سے نکل جاتا تھا لوگ کھڑے ہو ہو کر سلام کرتے تھے۔ جلسوں میں میری تقریریں سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے اور مجھے اخیر میں بولنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ اب ایک دن یہ ہے کہ مجھ پر تالیاں بجائی جاتی ہیں اور میرا سوانگ نکالنے کی تیاریاں ہوتی ہیں۔ اندھے میں پھر بھی تمیز ہے۔ ورنہ بنارس کے شہدے دن دہاڑے میرا گھر لوٹ لیتے۔

دفعتاً اردلی نے آ کر مسٹر کلارک کا حکم نامہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ راجہ صاحب نے چونک کر لفافہ کھولا تو ششدر ہو گئے۔ مصیبت پر مصیبت! رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی۔

چپڑاسی: حضور کچھ جواب دیں گے؟

راجہ صاحب: جواب کی ضرورت نہیں۔

چپڑاسی: کچھ انعام نہیں ملا۔ حضور ہی.....

راجہ صاحب نے اسے اور کچھ نہ کہنے دیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر پھینک دیا۔ اردلی چلا گیا۔

راجہ صاحب سوچنے لگے۔ پاجی کو انعام مانگتے شرم بھی نہیں آتی۔ گویا میرے نام کوئی سپاسنامہ لایا ہے۔ کتے ہیں اور کیا۔ کچھ نہ دو تو کاٹنے دوڑیں۔ جھوٹی سچی شکایتیں کریں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کلارک نے کیوں اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ جان سیوک سے کسی بات پر ان بن ہو گئی کیا؟ شاید صوفیہ نے کلارک کو ٹھکرا دیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ لوگ یہ تو کہیں گے کہ اندھے نے راجہ صاحب کو نیچا دکھا دیا۔ پر اس کا

دوہائی سے تو گلا چھوٹے گا۔

اس وقت ان کی حالت اس آدمی کی سی تھی جو اپنے منہ زور گھوڑے کے بھاگ جانے پر خوش ہو۔ اب ہڈیوں کے ٹوٹنے کا خوف تو نہیں رہا۔ میں گھاٹا میں نہیں ہوں۔ اب تو روٹھی رانی بھی خوش ہو جائیں گی۔ اندو سے کہوں گا کہ میں نے ہی مسٹر کلارک سے اپنا فیصلہ منسوخ کرنے کے لیے کہا ہے۔

وہ کئی روز سے اندو سے ملنے نہ گئے تھے۔ اندر جاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ اندو کے طعنوں کا کیا جواب دوں گا۔ اندو بھی اس خوف سے ان کے پاس نہ آتی تھی کہ مبادا میری زبان سے کوئی ناخوشگوار لفظ پھر نکل جائے۔ ہر باہمی قضیہ کے بعد جب وہ اس کے اسباب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تھی تو اسے معلوم ہوتا تھا کہ میں ہی خطاوار ہوں اور اپنی خودسری پر اسے دلی ملال ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے بچپن ہی سے شوہر پرستی کا بلند معیار اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس معیار سے گرنے پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی اور اپنے کو ملامت کرتی تھی۔ میرا فرض ان کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ مجھے تن من سے ان کی سیوا کرنی چاہیے۔ میرا اولین فرض ان کے متعلق ہے۔ ملک و قوم کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر میری نحوست بار بار مجھے فرض کے راستہ سے ہٹا دیتی ہے۔ میں اس اندھے کے پیچھے خواہ مخواہ الجھ پڑی۔ وہ عالم ہیں اور دور اندیش۔ یہ میری گستاخی ہے کہ میں ان کی رہنمائی کا دعویٰ کرتی ہوں۔ جب میں ذرا ذرا سی باتوں پر اپنی خودداری کا لحاظ کرتی ہوں تو ان سے کیسے امید کروں کہ ہر معاملہ میں بے لوث رہیں؟

کئی روز تک دل میں اس طرح سوچتے رہنے کے سبب اس کو سور داس سے چڑ سی ہو گئی۔ اس نے خیال کیا کہ اسی کمبخت کی وجہ سے میں اس عذاب میں مبتلا ہوں۔ اسی نے ہمارے درمیان مغائرت پیدا کر دی ہے۔ آخر اس زمین سے محلّہ والوں ہی کو فائدہ پہنچتا ہے نا۔ تو جب انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو اس اندھے کی کیوں نانی

مرتی ہے۔ کسی کی زمین پر کوئی جبراً کیوں قبضہ کرے۔ یہ صرف ڈھکوسلا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ کمزور لوگ تو ابتدائے زمانہ سے ستائے جاتے رہے ہیں اور ستائے جاتے رہیں گے۔ جب یہ عالمگیر رواج ہے تو پھر کیا ایک کم اور کیا ایک زیادہ۔

انہیں دنوں میں جب سورداس نے راجہ صاحب کو شہر میں بدنام کرنا شروع کیا تو اس کی محبت کا پلہ نہایت تیزی سے دوسری طرف جھکا۔ اسے سورداس کے نام سے چڑ ہو گئی۔ یہ ٹکے کا آدمی اور اس کی اتنی جرأت کہ ہم لوگوں کے سر چڑھے۔ اگر جمہوریت کے یہی معنی ہیں تو ایشور ہمیں اس سے بچائے۔ یہ زمانہ کا انقلاب ہے ورنہ اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے اوپر اس طرح چھینٹے اڑاتا۔

اندو غریبوں پر رحم کر سکتی تھی مگر ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکتی تھی۔ رحم میں فضیلت کی شان ہے اور انصاف میں جمہوریت کا جذبہ۔ وہ سوچتی کہ یہ اس بدمعاش کو پولیس کے حوالہ کیوں نہیں کر دیتے؟ مجھ سے تو یہ ذلت نہ برداشت ہوتی۔ نتیجہ خواہ کچھ ہوتا مگر اس وقت تو ایسی بری طرح پیش آتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔

وہ اسی قسم کے برے خیالات میں غرق تھی کہ صوفیہ نے جا کر اس کے سامنے راجہ پر سورداس کے ساتھ بے انصافی کرنے کا اتہام لگایا۔ کھلی ہوئی دھمکی دی گئی۔ اندو کو اتنا غصہ آیا کہ سورداس کو پاتی تو اس کا منہ نوچ لیتی۔ صوفیہ کے چلے جانے پر وہ غصہ میں بھری ہوئی راجہ صاحب کے پاس پہنچی مگر معلوم ہوا کہ وہ چند روز کے لیے علاقہ پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ دن اس نے بڑی بے چینی سے گزارے۔ افسوس ہوا کہ چلے گئے اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔

راجہ صاحب علاقہ سے لوٹے تو انہیں مسٹر کلارک کا حکم نامہ ملا۔ وہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اندو ان کے پاس گئی اور بولی۔ ''علاقہ پر گئے اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ گویا میں گھر ہی میں نہیں ہوں۔''